مولانا ابوالکلام آزاد

مضمون نگاری مقابلہ

(انعام یافتہ مضامین ۹۸-۱۹۹۷)

مولانا ابوالکلام آزاد اور آج کے مسائل

انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز

عرضِ ناشر

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی آزادی کے کچھ اہم ترین معماروں میں سے ایک شخصیت اور آزاد ہندوستان کے سب سے پہلے وزیرِ تعلیم تھے۔ وہ ہماری گنگا جمنی اور ملی جلی تہذیب کے ورثے کے مظہر تھے اور انھوں نے ہندوستانی تہذیب کو اسلامی علمیت اور دنیا کے مختلف مذاہب کے گہرے مطالعے سے مالا مال کیا تھا۔ وہ بیک وقت موجودہ دنیا کے حالات کی گہری بصیرت بھی رکھتے تھے اور ہندوستان کی ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک کے روپ میں ابھرتی ہوئی تصویر کو بھی صاف طور پر دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے انھیں اس بات کا بہترین موقع مل گیا کہ وہ اپنے اس تصور کی بنیادیں ایک ایسی تعلیمی پالیسی کی ابتدا کر کے رکھ سکیں جو ہماری قومی زندگی کے تمام تقاضوں اور چنوتیوں کو پورا کر سکے۔ اس طرح ہمارے ملک میں بہت سے ایسے اداروں کی بنیاد رکھنے کا عظیم کام انھوں نے انجام دیا جنھوں نے بعد میں سائنٹفک، تکنیکی اور ثقافتی تحقیق و مطالعے کی ترقی اور نشو و نما میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اگر ہندوستان کی سائنسی اور تکنیکی کامیابیوں کا پوری دنیا میں چرچا ہے تو بہت حد تک یہ مولانا کی دور رس فکر اور بصیرت کی ہی دین ہے۔ ثقافت کے میدان میں اُن کی قایم کی ہوئی تین اکادمیاں۔ جن کا تعلق اسٹیج کے فن (سنگیت ناٹک اکادمی)، ادب (ساہتیہ اکادمی) اور فنونِ لطیفہ (للت کلا اکادمی) -- آج بھی ہمارے ملک کے ثقافتی ماحول میں روحِ رواں ہیں۔ ایک اور میدان جس میں مولانا نے ایک دیرپا اثر چھوڑا وہ دوسرے ملکوں سے ثقافتی رشتے قایم کرنا تھا۔ انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز، جس

مولانا ابوالکلام آزاد اور آج کے مسائل

حق اشاعت : انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز ۱۹۹۸

ناشر:

ہماچل سوم

ڈائرکٹر جنرل

انڈین کاؤنسل فار کلچر ریلیشنز

آزاد بھون، آئی۔پی۔اسٹیٹ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

تزین و طباعت :

سائبیر آرٹ انفارمیشن پرائیویٹ لمیٹڈ

سی۔۲، کانو چیمبر، تیسری منزل، ساؤل نگر،

نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۴۹

کمپوزنگ :

انجمن کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر

اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

نے اس سال اپریل میں پچاس سال پورے کر لیے ہیں، اس کا قیام اُن کی ذاتی تحریک سے ہی عمل میں آیا تھا۔

'مولانا آزاد سالانہ مضمون نگاری مقابلہ' ۱۹۸۹ میں اس مقصد سے شروع کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے اس عظیم فرزند اور انڈین کاؤنسل فار کلچر ریلیشنز کے بانی صدر، نے جو نادر ورثہ چھوڑا ہے اس کی یادوں کو تازہ رکھا جاسکے۔ اس عرصے میں اس مضمون نگاری مقابلے میں ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے نوجوانوں نے متواتر گہری دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔ اِن مضمون نگاروں سے ایسے موضوعات پر ہندی، اردو، اور انگریزی میں مضامین طلب کیے جاتے ہیں جو بیک وقت مولانا کو بھی دل و جان سے عزیز تھے اور اُن کی اہمیت آج بھی اتنی ہی باقی ہے۔

یہ سال، جو نئی صدی کی ابتدا کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز کی پچاسویں سالگرہ کا بھی سال ہے، اس میں مجھے ۹۸-۱۹۹۷ کے مضمون نگاری مقابلے میں انعام یافتہ مضامین کی اس خصوصی جلد کو شائع کرتے ہوئے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ میں اِس مضمون نگاری مقابلے میں شریک ہوئے تمام نوجوان مضمون نگاروں سے اظہارِ مسرت کرتا ہوں اور اُن اہم شخصیتوں کا ممنوں ہوں جنھوں نے اس مقابلے میں ججوں کے فرائض انجام دے اور جن کی لگن اور محنت کے نتیجے میں یہ جلد منظر عام پر آسکی۔

ہماچل سوم

(ہماچل سوم)
ڈائریکٹر جنرل
انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز

مولانا آزاد انعامی مقابلہ کا مختصر پس منظر

جناب ہمایوں کبیر، اس وقت کے وزیر شہری ہوابازی نے جب ۱۱ر مارچ ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد کی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' کا مسودہ کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز کو پیش کیا تو آپ نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اس کتاب کی آمدنی سے مولانا آزاد انعامی فنڈ قائم کیا جائے اور اس فنڈ کی آمدنی سے دو سالانہ انعامات دیئے جائیں۔ پہلا انعام کسی ایسے غیر مسلم ہندوستانی کو دیا جائے جو انگریزی میں اسلام پر سب سے اچھا مقالہ لکھے۔ دوسرا انعام کسی ایسے مسلم شہری کو دیا جائے، جو انگریزی زبان میں ہندو دھرم پر سب سے اچھا مقالہ لکھے۔ اس طرح مولانا آزاد انعامی مقابلے کی ابتداء ہوئی۔

کاؤنسل نے یہ مقابلہ ۱۹۸۹ء سے شروع کیا۔ اس سال مولانا آزاد کا صد سالہ یوم پیدائش منایا جارہا تھا۔ مولانا نہ صرف ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے بلکہ آئی۔ سی۔ سی۔ آر کے صدر بھی رہ چکے تھے۔

اس مقابلے میں ہندوستان اور دوسرے سارک ممالک کے ایسے شہری بھی شامل ہو سکتے ہیں جن کی عمر ۳۰ سال سے کم ہو۔ مضامین کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے جو مولانا کے فکر و نظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اوّل، دوسرے اور تیسرے انعام یافتگان کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔ کسی عظیم ترین شخصیت سے یہ انعامات تقسیم کرائے جاتے ہیں۔

جیوری کے ممبران

جناب گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید

پروفیسر عبدالحق

۹۸-۱۹۹۷ء کے منعقدہ مقابلے میں ۱۲/ انعام یافتگان شامل تھے جن میں سے دو نیپال کے تھے۔

۱۹۹۰ میں یہ طے کیا گیا کہ مقابلہ تین زبانوں یعنی ہندی، اردو اور انگریزی میں کیا جائے اور تینوں زبانوں میں مختلف موضوع رکھے جائیں۔ ۹۸-۱۹۹۷ کے مقابلے میں تینوں زبانوں کے موضوعات اس طرح تھے۔

ہندی: سمکالین سندربھ اور مولانا آزاد

اردو: مولانا آزاد اور آج کے مسائل

انگریزی: دی رول آف ایجوکیشن اینڈ کلچر ان ڈولپمنٹ

مولانا ابوالکلام آزاد اور آج کے مسائل

شمیم . اے . رانا

عصر حاضر کے جیّد نقّاد، ممتاز محقق، ماہر لسانیات اور اردو دنیا کو تازہ ترین افکار سے آشنا کرانے والے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی مابہ الامتیاز تصنیف ''اردو مابعد جدیدیت پر ایک مکالمہ'' میں موجودہ دور کے تغیرات و انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے آج کے مسائل کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''برقیاتی میڈیا کی یلغار سے پوری دنیا زیروزبر ہو رہی ہے نئی تکنیکی ایجادات، مصنوعی سیاروں، ترسیل و تبلیغ کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، کمپیوٹر ٹکنالوجی، کمرشل تقاضوں، صارفیت کی ریل پیل اور منڈی معیشت نے جہاں بظاہر نئی ترقیوں کے دروازے کھول دیے ہیں وہاں مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں جن کا کوئی آسان حل سامنے نہیں ہے۔ فیصلوں کی طاقت اب 'سیاسی قدر' سے 'کمرشل قدر' کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ یہ معمولی تبدیلی نہیں جس انفارمیشن ہائی وے کا چرچا ہے ہم سب

فہرست

مولانا ابوالکلام آزاد اور آج کے مسائل

ہے۔ صارفیت کی اس دوڑ میں دولت کی ہوس کا نتیجہ خود غرضی، بے حسی اور بے اطمینانی ہے۔

مصروفیت اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اخلاقی اقدار کی طرف توجہ بھی نہیں کی جاتی۔ اچھے اور بُرے کی تمیز کو 'سب چلتا ہے' کہہ کر ختم کر دیا گیا ہے۔ اب منزل تک پہنچنا ضروری ہو گیا ہے خواہ اس کے لیے کوئی راہ منتخب کی جائے۔ صداقت، بہادری اور بھلائی کی جگہ مصلحت، افادیت اور ضرورت نے لے لی ہے۔ مذہب جو اخلاق کی تعلیم کا سب سے بڑا مظہر تھا وہ خرافات کا شکار ہو کر سیاسی حربہ بن گیا ہے یا محض رسم۔

ایسے سنگین دور میں جب انسان مادّی اور روحانی طور پر شدید بحران میں مبتلا ہے، نگاہیں کسی مصلحِ قوم یا رہنما کو تلاش کرتی ہیں جس کی شخصیت، سیرت، کردار، افکار و نظریات، اعمال و اقوال آج کے مسائل حل کرنے میں مددگار ہوں۔ قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والی شخصیت کی سنجیدہ تلاش ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد تک لے جاتی ہے کہ ان کے نظریات و تصوّرات میں ہمیں آج کے بہت سے مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے عہد سے آگے بڑھ کر آنے والے زمانے کے دل کی دھڑکنیں محسوس کر لیتے ہیں اور پھر انھیں ہم سے جدا ہوئے زیادہ وقت بھی نہیں گزرا، اس لیے ان کے تصوّرات و نظریات کی اہمیت و افادیت ہنوز برقرار ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی زندگی ایک بلند پایہ مفکر، ایک صحافی، ایک ادیب و انشا پرداز اور صاحبِ قلم کی حیثیت سے شروع کی۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کا

اس کی زد میں ہیں۔ خرید و فروخت، حصولِ علم، تجارت،
ترسیل سب پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ہوش رُبا ترقی نے تغیرات اور اقدار کی پامالی کا لامتناہی سلسلہ قائم کیا ہے۔ آج مشین کی جگہ کمپیوٹر نے لے لی ہے۔ مواصلاتی انقلاب نے فاصلوں کو کم کر دیا ہے۔ فطرت کی تسخیر کے معنی جنگلوں کی صفائی اور ماحول کے توازن میں خلل کے ہو گئے ہیں۔ شہروں کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے فطرت کا سایہ نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم تمام ضمنی جنگوں کو ختم کرنے کے لیے لڑی گئی تھی۔ لیکن اس نے پہلے سرد جنگ اور اب نیوکلیائی ہتھیاروں کی وجہ سے تیسری جنگِ عظیم کا مستقل خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ جمہوری نظام یقیناً دوسرے نظاموں کے مقابلے فرد اور سماج کی بھلائی کا ضامن ہو سکتا تھا لیکن اس کو بھی انتخاب میں طاقت اور دولت کے استعمال نے داغدار کر دیا ہے۔

تعلیم میں اضافہ ہوا ہے لیکن تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ اب حصولِ علم کا مقصد کامیاب اور خوشحال زندگی گزارنا ہے۔ آج ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تعیّشات سے لطف اٹھانا بھی لازم ہو گیا ہے۔ سماج کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیدا کرنا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ خرچ کیا جاسکے۔ زیادہ پیدا کرنے کے لیے زیادہ کام کرنا اور پھر اس زیادہ کام سے ہونے والی تھکن کو دور کرنے کے لیے زیادہ تفریح اور تفریح کے لیے سنسنی خیزی، تشدّد اور جنس کو معیار بنا دیا گیا ہے جس کی ترسیل ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے کی جارہی

feels, ought to be, but in the modern world they are not, at least in a great majority of Cases"

(جانور اس وقت تک خوش رہتے ہیں جب تک وہ صحت مند ہوں اور انھیں خوراک حاصل ہو، انسان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے مگر جدید دنیا میں انسان خوش نہیں۔ کم از کم اکثریت کا حال یہی ہے)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تہذیب نے اپنی عظیم کامیابیوں کے باوجود انسان کی طلب کا صرف نصف حصہ فراہم کیا ہے۔ اس نے جسم کے تقاضے مہیا کیے لیکن روح کے تقاضے فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ مولانا آزاد کو اس انسانی کرب کا شدّت سے احساس تھا، اسی لیے اپنے افکار کی ترسیل کے لیے انھوں نے جن مذہبی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے ان کا مقصد ان اعلا اقدار کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے جو انسان کو مادّیت سے بلند کر کے روحانی اور ذہنی دنیا سے وابستہ کر دیں۔ انھوں نے مذہب کو بنیاد مان کر بے خوفی، طاقت، توانائی اور حوصلے کا پیغام دیا۔ انھوں نے مذہب کا اعتراف ان معنوں میں کیا ہے کہ وہ ہماری زندگی کے ایک ایسے خلا کو پُر کرتا ہے جسے اور کوئی خیال پُر نہیں کر سکتا۔ مولانا آزاد نے اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے روحانی ہدایت کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے 'الہلال' میں یہ اعلان کیا:

"انسان، ذہن و جسم کی کتنی ہی عظمتیں حاصل کر لے لیکن روح اور اخلاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ پاکیزگی بھی حاصل نہیں

مقام ایک معلّمِ انسانیت، مصلح، داعیِ حق اور عظیم رہنما کا منصب تھا۔ اس منصبِ عظمیٰ کے لیے مبدءِ فیض نے ان کو علم و فضل، فکر و تدبّر اور عزم و ایمان کی لازوال صلاحیتوں سے سرفراز کیا تھا۔ مولانا آزاد کی زندگی اور خدمات پر ایک غائرانہ نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس ستودہ صفات ہستی کو ایک خاص مقصد اور مخصوص مشن کے ساتھ دنیا میں بھیجا تھا۔ چناں چہ 'الہلال' اور 'البلاغ' میں اپنی تحریروں کے ذریعے مولانا آزاد نے دینِ مبین کے چہرۂ تاباں سے لغزشِ ذہن و فکر کی نقابیں اُلٹ کر اس کی حقیقی شکل و صورت دنیا کے سامنے پیش کی اور ملّتِ اسلامیہ کو اس کی کھوئی ہوئی عظمت اور بلند مقام کا احساس دلایا اور مذہب کی اہمیت پر زور دیا۔

مذہب اور سائنس

آج ہمارے دور کا المیہ یہ ہے کہ جسم اور روح کی علاحدگی اور اس کے بعد خدا کو انسانی زندگی سے جدا کرنے کے نتیجے میں خود انسان سامانِ حیات کی افراط کے درمیان احساسِ محرومی سے دوچار ہے۔ آج انسان کی صورت میں ہمارے سامنے ایک ایسا وجود ہے جس کو سب کچھ فراہم کرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر حقیقی خوشی دیکھنا ہمارے لیے مقدر نہیں۔ برٹینڈر رسل نے اپنی کتاب "The Conquest of Happiness" کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

"Animals are happy so long as they have
health and enough to eat Human beings, one

برابر اضافہ اور توسیع ہو رہی ہے۔ مولانا آزاد نے اسلحہ اور خوں ریزی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا ذمہ دار مذہب سے بے گانگی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کو قرار دیا ہے۔ 'الہلال' میں لکھتے ہیں:

> ''قوموں اور ملکوں کی عزت اگر زیادہ خون بہانے اور انسانی گلوں کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں ہوتی تو درندوں کے بھٹ انسانی عبادت گاہوں سے زیادہ مقدس ہوتے مگر اس کے شرف و تقدیس کا معیار الٰہی اوصاف اور ملکوتی اخلاق ہیں۔ اگر چند لمحے بھی اس کے میسر آجائیں تو وہ خوں خوارانہ فتح یابیوں کے ہزار سال سے زیادہ افضل ہوں''۔

تصور قومیت اور سیکولر اقدار

خوں خوار ذہنیت سے بچنے کے لیے اور فسادات کو روکنے کے لیے پیار و محبت، اخوت، مساوات، ملاپ کا رویہ اختیار کرنے کے لیے ہی مولانا آزاد نے متحدہ قومیت اور عالم گیر برادری کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے اسلام کے اس اصول کو بنیاد مان کر کہ ایک خدا کے ماننے والے ایک برادری میں شامل ہیں انسان کو مذہبی اور سیاسی تقسیموں سے بلند کیا۔ انھوں نے مذہب کو انسانی فطرت کا وہ اعلا درجہ قرار دیا ہے جو انسانی ذہن کو کل انسانیت سے جوڑ دیتا ہے اور قومیت کے اس خطرناک فریب سے نجات دلاتا ہے جس سے عالم گیر برادری کا تصور مجروح ہوتا

کر سکتا اگر اس کا اعتقاد اور عمل روحانی ہدایت کی روشنی سے
محروم ہو جائے"۔

روحانی ہدایت سے محرومی کے سبب خدا کے وجود پر اعتقاد کا متزلزل ہونا صرف مولانا آزاد کے دور کا المیہ نہ تھا، آج بھی یہی صورتِ حال ہے۔ طاقت اور دولت کے حصول کے بعد انسان خود کو کل کائنات کا مختار سمجھ بیٹھا ہے۔ سائنس کے فروغ نے جہاں انسان کو متعدد آسائشیں اور سہولتیں مہیا کرائی ہیں وہیں خدا کے وجود کو ثابت نہ کرپانے کے سبب انسان کو وجودِ باری کے متعلق شک میں مبتلا کیا ہے۔ سائنس کی بے پناہ ترقی کے اس دور میں انسان چاند کے بعد دوسرے سیّاروں پر کمند لگانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ ذہن انسانی کی نقل یعنی کمپیوٹر کے بعد جسم انسانی کی نقل یعنی روبوٹ کے کامیاب تجربے کر رہا ہے۔ اعضائے انسانی کی تبدیلی (Transplantaion) کے ذریعے انسان کی خطرناک بیماریوں کا علاج کیا جا رہا ہے۔ قدرتی وسائل کو انسان کے لیے زیادہ سے زیادہ کار آمد بنایا جا رہا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ سائنس کی اس ترقی کے سبب محض تعمیری ہی نہیں، تخریبی قوتوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ایک نیپام بم، جراثیم بم اور زہریلی گیس چھوڑ کر تمام آبادی کو گونگا، بہرا اور اندھا کیا جا سکتا ہے، ہاتھ پاؤں شل کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ایٹم بم گرا کر ہنستی کھیلتی آبادیوں کو آناً فاناً ختم کیا جا سکتا ہے۔ صرف انسان ہی اس کی زد میں نہیں آتے بلکہ چرند پرند، نباتات وغیرہ بھی تہس نہس ہو جاتے ہیں۔ نیز اس کے اثرات برسوں تک باقی رہتے ہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار اسلحہ سازی کا ہے اور اس میں

آج ہمارے سامنے ہے، جب حق وصداقت گناہ گاروں کی طرح عدالت میں کھڑی ہے اورظلم وناانصافی کا بول بالا ہے۔ فرقہ پرستی اور مذہبی جنون کی ہوا گرم ہے۔ متحدہ قومیت کے اس آفاقی پیغام کے برخلاف آج سیاسی بازی گروں نے ہندو اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم قرار دے کر اپنے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ صورتِ حال مجاہدینِ آزادی یا مولانا آزاد کے خوابوں کی تعبیر نہیں۔ جد وجہدِ آزادی کی تحریک صرف سامراج مخالف نہ تھی بلکہ بہتر زندگی کے حصول کی کوشش بھی تھی وہ مقصد ابھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس لیے وہ تحریک، وہ جد وجہد آج بھی جاری ہے اور اسی لیے مولانا آزاد کے پیغام کی افادیت آج بھی باقی ہے۔

ہندوستان کی بقا کے لیے یہ لازم ہے کہ ظلم، ناانصافی، جبر اور لوٹ مار کے خلاف متحدہ طور پر تحریک شروع کی جائے۔ تمام فرقوں کے لوگ اس تحریک میں شریک ہوں خواہ اس کی رہنمائی کسی بھی فرقے کے فرد یا افراد کے ہاتھوں میں ہوں کیوں کہ ظلم وناانصافی کے خلاف لڑنے والے شخص کا صرف ایک مذہب ہوتا ہے اور وہ ہے حق وانصاف۔ وہ طاقتیں جو مولانا آزاد اور دوسرے رہنماؤں کی پکار پر متحد ہوئی تھیں کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک بار پھر ملک کی بقا اور سالمیت کے لیے متحد نہ ہو جائیں۔ مذہب ایک طاقتور سماجی عنصر ہے اسے فرقہ پرست طاقتوں اور اقتدار کے طلب گار لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بننے دینا چاہیے کہ وہ ایک فرقے کے جذبات کو مشتعل کر کے بے گناہ اور مظلوم عوام کا خون بہائیں اور ان کی سر دلاشوں پر پایۂ تخت استوار کریں۔

ہے۔

مولانا آزاد نے ہندوستان کے قدیم حالات، عصری مسائل اور مشرق و مغرب کے کش مکشِ استعمار کا جائزہ لے کر مستقبل میں آزاد ہندوستان کا ایک نقشہ مرتب کیا جس کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کو متحدہ قومیت کے تصور پر استوار کیا جائے تاکہ مستقبل میں سرزمینِ ہند پر بسنے والے مختلف فرقے قومی زندگی میں رشتۂ اخوت و مساوات مربوط کرسکیں۔ متحدہ قومیت کا ایسا جامع تصور انھوں نے پیش کیا کہ ہر فرقہ و مذہب کو بلاتردّد و اکراہ قبول ہو۔ قومی یک جہتی کا فروغ ان کے لیے ایک مشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنے ایک خطبہ میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور ایک نیشن بن جائیں''۔

مولانا آزاد تمام زندگی پوری قوم کو دعوتِ عمل دیتے رہے۔ برطانوی سامراج کے خلاف متحدہ طور پر صف آرا ہونے کا پیغام سب سے پہلے انھوں نے ہی دیا۔ بے شک انگریزی سامراج سے ہم چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں لیکن ایک بامقصد دعوتِ عمل آج بھی ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے لیے اس سے بہتر مقصد اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم ایک بہتر دنیا، ایک بہتر سماج، ایک بہتر قوم اور گاندھی و آزاد کے دیش کی تعمیر کے لیے خود کو وقف کردیں۔ یقیناً جدوجہدِ آزادی کے علم برداروں نے جس عظیم الشان مقصد کے لیے قربانیاں دی تھیں وہ ایسا ہندوستان نہ تھا جو

تقویت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کا سبب مولانا آزاد کے کردار کی بلندی اور سیرت کی پختگی تھی۔ آج ہمارے دور کا المیہ سیرت و کردار کی کمزوری ہے۔

آج کا سیاست داں اپنے عقائد و نظریات کسی وقت بھی بدل سکتا ہے۔ آج سیاست کا مطلب عقائد و نظریات کی پاسبانی نہیں بلکہ مخصوص جماعت کے ساتھ یا پھر فرد کے ساتھ وفاداری کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد کے نزدیک افراد کی اہمیت صرف یہ ہے کہ وہ بعض اصول و نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ 'ترجمان القرآن' میں لکھتے ہیں:

"کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔"

آج سچائی کی جگہ مصلحت اور دروغ گوئی نے لے لی ہے۔ شخصیت سے وفاداری کا اظہار خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعے ہوتا ہے۔ ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے صاحبِ اقتدار کی خوشامد ہمارے معاشرے کا خاصہ ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لیے لوگ اپنے عقائد و نظریات ہی نہیں خود کو بھی فروخت کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں مولانا آزاد کا استغنا ملاحظہ ہو کہ کبھی اقتدار کے لالچ میں کوئی کام نہیں کیا۔ جاہ و منصب سے بے نیازی کی بہت سی مثالیں ان کی زندگی سے لی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر رجندر پرساد نے اپنی خود نوشت سوانح عمری 'اپنی کہانی' میں لکھا ہے کہ مارچ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں مولانا آزاد کو کانگریس کا صدر منتخب کرنے کی تجویز پیش کی گئی لیکن انھوں نے گاندھی جی سے ملاقات کر کے کانگریس کی صدارت کے اس قومی اعزاز کو قبول کرنے سے انکار

سیاست اور اقتدار کی ہوس

ہندوستان کو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ لیکن جہالت، سماجی پس ماندگی اور محض زندہ رہنے کے لیے روزانہ کی اعصاب کو شل کر دینے والی خرکاری میں جکڑے ہونے کے باعث عوام کی کثیر تعداد ابھی تک فرسودہ خیالات، رسوم و رواج اور از کار رفتہ اقدار کے شکنجے میں گرفتار ہے۔ اسے جمہوری طرزِ حکومت میں اپنے حقوق سے ذرا بھی واقفیت نہیں۔ انتخابات کے عمل میں دولت اور طاقت کے اقتدار نے رائے عامہ کو فرضی بنا دیا ہے۔ عوام ان اشخاص کو اپنا نمائندہ بنانے پر مجبور ہیں جنھیں وہ قطعی ناپسند کرتے ہیں۔ ایسے تشویش ناک حالات میں جدوجہدِ آزادی کے ان عظیم رہنماؤں کی یاد آتی ہے جن کے نام ہی ان کے کردار کی پہچان تھے، خواہ مہاتما گاندھی ہوں، نہرو ہوں یا پھر مولانا آزاد۔ سیاست کو ان لوگوں نے ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے اختیار نہیں کیا بلکہ مخلوق کی خدمت کا شوق انھیں اس میدانِ کارزار تک کھینچ لایا ورنہ مولانا آزاد جیسے تنہائی پسند اپنی طبیعت کے برخلاف کیوں کر اس میدان میں چلے آتے۔

سیاست میں آنے کے باوجود مولانا آزاد نے نفاق، موقع پرستی، خوشامد، چاپلوسی، مایوسی اور خوف سے کبھی موافقت نہ کی۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک جماعت تھے اس لیے انھیں اپنے نظریات کی ترسیل کے لیے کسی جماعت یا فرد کی ضرورت نہ تھی۔ کانگریس کا صدر منتخب ہونے پر مولانا کے اعزاز و اکرام میں شاید کچھ اضافہ ہوا ہو لیکن درحقیقت مولانا آزاد کی صدارت سے کانگریس کو

سونپتے رہے ہیں لیکن گزشتہ چند سال سے ایوانِ زیریں میں عورتوں کی مناسب نمائندگی کے لیے 33% ریزرویشن کا مسئلہ سامنے آیا ہے جسے اب تک مختلف سیاسی پارٹیاں بوجوہ ٹالتی رہی ہیں۔ اس معاملے پر ایک مذاکرے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ اسلام عورتوں کی حکمرانی قبول نہیں کرتا۔ اس قول کی دلیل کے لیے جو حدیث پیش کی گئی اس کے الفاظ یہ ہیں:

> "جب تمھارے امیر بدترین لوگ ہوں اور مال دار بخیل اور تمھاری حکومت عورتوں کے اختیار میں چلی جائے گی تو پھر زمین کے اندر تمھارے لیے زیادہ اچھا ہوگا بمقابلہ زمین کی سطح کے۔"

بظاہر رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے یہی گمان پڑتا ہے کہ اسلام عورتوں کو حکومت کی اجازت نہیں دیتا لیکن اس حدیث کی تشریح میں مولانا آزاد کے خیالات پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ ان الفاظ سے ہرگز وہ معنی مراد نہیں جس نتیجے تک علمائے دین پہنچتے رہے ہیں۔ مولانا آزاد لکھتے ہی:

> "امور کم الی نسائکم سے مقصود یہ نہیں کہ عورتیں تمھاری بادشاہ نہ ہوں نہ یہ مقصد ہے کہ عورتوں کے مشورے سے کام انجام پائیں بلکہ یہ اشارہ ہے شاہانِ نفس پرست اور اُمرا عمال کی حرم سراؤں کی زندگی کی طرف گویا سرشتہ حکومت مجلسِ شوریٰ اور اصحابِ حل و عقد کی جگہ حرم سرا کے عشرت خانوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔"

کر دیا۔ ۱۹۵۷ء کے عام انتخابات سے قبل صدرِ جمہوریہ ہند کے اعلا منصب کے لیے مولانا آزاد کا نام بھی زیرِ غور تھا لیکن وہ عہدے اور منصب سے زیادہ کام کے قائل تھے۔ اس لیے ایک اخباری نامہ نگار کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"صدارت میں ایک وسیع باغ اور آرام دہ مکان کے سوا اور کیا رکھا ہے"۔

اقتدار کی خواہش انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ کسی خاص مقصد کے لیے طویل اور صبر آزما جد و جہد کے بعد راحت و آسائش کا موقع مل رہا ہو۔ اس وقت اس انسانی کمزوری پر قابو پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ آج ہمارے سیاست داں مولانا آزاد کی پیروی میں یہی رویہ اختیار کریں تو ہماری سیاست اور معاشرہ کی متعدّد خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔

مرد وزن کی مساوات

انسانی تاریخ میں اب تک کے مروّجہ گوناگوں معاشرتی نظاموں میں جمہوریت ہی کا ادعا یہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ جمہوریت میں عورت اور مرد کو جس طور رائے دہی اور ایوانِ حکومت کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق یکساں طور پر حاصل ہے اسی طرح مرد اور عورت کو عوام کی نمائندگی کرنے کا حق بھی مساوی طور پر حاصل ہے۔ حالاں کہ ہمارا ملک اس معاملے میں دیگر جمہوری ممالک سے بہتر ہے کہ تقریباً سولہ سال تک عوام اپنے منتخب نمائندے کے طور پر ایک عورت (محترمہ اندرا گاندھی) کو وزارتِ عظمیٰ کا جلیل القدر منصب

حاصل کرنے کا۔ جب کہ حصولِ علم تکمیل ذوق کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ ذریعہ معیشت کے لیے۔ یہ ذوق و شوق کی تکمیل ہی تھی جس نے مولانا آزاد کو عالم، مجتہد العصر، مفسر قرآن، مشرق و مغرب کے افکار پر گہری نظر رکھنے والا بلند پایہ مفکر، اپنے دور کے حالات کا نبّاض، معالج اور مستقبل کی پیشین گوئی کرنے والا مدبّر بنادیا۔ انھوں نے کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ انھوں نے فلسفہ، مذہب، قرآن، تاریخ، سیاست، نجوم، سائنس اور معاشیات جیسے متنوع اور مختلف النوع موضوعات کا عمیق مطالعہ اس لیے نہیں کیا تھا کہ اس کے ذریعے کوئی ملازمت حاصل کرنا چاہتے تھے یا اس علم کے ذریعے مالی منفعت حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ ان کے لیے علم وسیلہ نہیں، مقصد تھا۔ اسی لیے دیوبند کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> "عزیزانِ ملت، یاد رکھیے، دنیا نے علم کو ہمیشہ وسیلہ سمجھا ہے مگر مسلمانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے علم کو کبھی وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ مقصد سمجھا۔ انھوں نے کبھی بھی علم کو اس لیے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے معیشت حاصل کریں گے یا کسی سرکاری منصب پر فائز ہوں گے۔ مسلمانوں نے ذریعۂ معیشت کسی اور چیز کو بنایا اور علم کو صرف علم کے لیے سیکھا۔"

وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کے لیے ان کی کوششیں آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ مغربی تعلیم کے جواز کا مسئلہ ہندوستان میں ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے۔ مذہبی خیال اور قومیت کے جوش میں لوگ

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ عورت تجارت کرسکتی ہے، اپنی معیشت کا انتظام کرسکتی ہے، جائداد کی خرید و فروخت کرسکتی ہے، تعلیم حاصل کرسکتی ہے، ملکوں کی سیر و سیاحت میں آزاد ہے، ملازمت کرسکتی ہے، اپنے اور دوسروں کے حقوق کی جد و جہد میں حصہ لے سکتی ہے۔ جب زندگی کے ان دائروں میں اسلام نے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تو سیاست اس سے باہر تو کوئی چیز نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پارلیمنٹ کے دروازے عورت پر کیوں کر بند ہو سکتے ہیں اور وزارت و سفارت، حکومت اور مملکت کے کسی عہدے اور ذمہ داری کے لیے محض عورت ہونے کی وجہ سے وہ کیوں کر نااہل قرار دی جاسکتی ہے۔ مولانا آزاد نے عورتوں کے مسائل اور موضوع پر جس بے پایاں آزادی اور گراں قدر اجتہاد کا ثبوت دیا وہ اس دور کے کسی عالم اور مفکر کو نصیب نہ ہوا۔

حصولِ تعلیم اور مسئلۂ روزگار

جیسا کہ پہلے ذکر آیا کہ آج تعلیم میں اضافہ ہوا ہے لیکن ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ یہ اضافہ جہاں حکومت کی روزگار پالیسیوں کی ناکامی کا غمّاز ہے وہیں یہ اس بات کا اشاریہ بھی ہے کہ اب تعلیم کا مقصد حصولِ علم نہیں، حصولِ معیشت ہے۔ آج اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کی کثیر تعداد علم نہیں ڈگری حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیتی ہے۔ یہ بڑی افسوس ناک صورتِ حال ہے کہ ڈگری کا حصول ایک ذریعہ بن گیا ہے روزگار

ایجادات اور دریافت ہائے نو بہ نو (Descoveries) سے واقف کرانے میں تو پیش پیش ہیں لیکن کوئی ایک اخبار بھی عوام کے خیالات بدلنے یا ملک و قوم کی تعمیر کا دعوے دار نہیں ہو سکتا اس کی وجہ صحافت میں سچائی، ایمانداری اور خلوص کا فقدان ہے۔ اردو اخبارات و رسائل تو اپنے پیروں پر جمے رہنے اور اپنی اشاعت بر قرار رکھنے کے لیے اربابِ اقتدار یا مخصوص گروہ کی زبان بولنے پر مجبور ہیں لیکن ساتھ ہی انگریزی اور ہندی جرائد بھی کسی مخصوص جماعت یا گروہ کا پروپیگنڈہ کرتے نظر آتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں صحافتی اقدار کی یہ پامالی مولانا آزاد جیسے بالغ النظر، بے باک اور نڈر صحافی کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی ہے کہ صحافت ان کے لیے کاروبار یا ذریعہ معاش نہ تھی۔ 'الہلال' کے تیور ابتدا ہی سے اس بات کے غماز تھے کہ سود و زیاں اور کسبِ معاش کی پرچھائیں بھی اس کے مقاصد پر نہیں پڑی۔ 'الہلال' اپنے بانی کے شایانِ شان پہلے ہی یہ اعلان کر چکا تھا:

وما اسئلکم علیه من اجر ○ ان اجری الا علی الله○

'الہلال' اصلاح اور دعوت الی الحق کی وہ پکار تھی جس نے انسان کے مقصدِ حیات کو آشکار کر دیا۔ مولانا آزاد نے اپنی صحافت کو ملک و ملّت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف رکھا۔ 'الہلال' اور پھر 'البلاغ' میں اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کو جد وجہدِ آزادی میں سرگرم حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ آج کوئی اخبار، کوئی رسالہ، کوئی جریدہ اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے ایک بڑی جماعت کی کثیر آبادی کو ایک عظیم مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا ہو۔ یہ مولانا کی آتش نوائی،

مغربی تعلیم کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ لیکن مولانا نے اس معاملے میں ایک متوازن رویہ رکھا جو تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھا۔ حالاں کہ مولانا آزاد نے اس بات پر زور دیا کہ ہماری تعلیم کی روح مشرقی اور ہندوستانی ہونی چاہیے تاکہ لوگ اپنی ملکی اور سماجی اقدار کو پہچانیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ بخوبی واقف تھے کہ مغرب سے سبق لے کر ایک سائنٹفک ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کے بغیر عصرِ حاضر کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے۔ ان کے نزدیک انگریزی زبان کی تعلیم نہ صرف مغربی علوم اور سائنس کے لیے بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ ایک موزوں نظامِ تعلیم کے بغیر قوم کی اصلاح ممکن نہیں اسی لیے قومی زندگی کی تعمیر کے واسطے جس نظامِ تعلیم کو انھوں نے موزوں سمجھا اس پر عمل کرکے آج بھی ملک و قوم کے متعدّد مسائل دور کیے جاسکتے ہیں۔

صحافت

اخبارات و رسائل عوام کے خیالات بدلنے، نئے رجحانات سے واقف کرانے، رائے عامہ ہموار کرنے اور ملک و قوم کی تعمیر کا بنیادی کام انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن آج انفارمیشن ہائی وے کے اس دور میں ایک طرف اخبارات و رسائل کا دائرۂ کار بتدریج وسیع تر ہوتا جارہا ہے تو دوسری طرف صحافت سستی، خوشامد پسند اور منفعت بخش کاروبار بنتی جارہی ہے۔ آج اخبارات نئی نئی معلومات،

کسے پتا تھا کہ دوستی کے لیے بڑھائے ہوئے اس ہاتھ میں خنجر پوشیدہ ہے اور کارگل میں پاکستانی فوجیں دراندازی کرتے ہوئے ہندوستان کی عظمت کو تاراج کرنے کی خواہاں ہیں۔ دوستی کی آڑ میں کھیلا گیا یہ کھیل جس قدر شرم ناک اور تکلیف دہ ہے اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز اس واقعے سے تقریباً ۴۵، ۵۰ سال پہلے دیا گیا مولانا آزاد کا درج ذیل بیان ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں کتنی دور تک دیکھ سکتے تھے اور کتنے پہلے انھوں نے اس واقعے کی پیش گوئی کر کے ہندوستانیوں کو خبردار کر دیا تھا:

"ہمسایہ ملکوں سے محبت کا برتاؤ کسی آئین سیاست میں بُرا نہیں۔ پڑوسی کو آفتوں سے بچانا اپنے گھر کی حفاظت ہی کا ایک رخ ہے لیکن عداوت و جنگ کے عنوان پر تقسیم املاک کا اضافہ اپنے آغوش میں توہّمات کے بے شمار پہلوؤں کو چھپائے رکھتا ہے ہر لمحہ فکر یہ سوچتے رہنا چاہیے کہ سطحی الفاظِ محبت کے پس منظر میں ایسی گہری سرنگیں نہ تعمیر کی جارہی ہوں جو ہمارے محلاتِ نشاط کو برباد کر سکیں"۔

مولانا آزاد کی دور اندیشی اور فراست سے انکار ممکن نہیں۔ تقسیمِ وطن کے وقت انھوں نے مسلمانانِ ہند کو سمجھایا تھا:

"پاکستان کا قیام جتنے مسائل حل کرے گا ان سے زیادہ نئے مسائل پیدا کرے گا"۔

مولانا آزاد کا یہ بیان حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ قیامِ پاکستان کے وقت سے اب

سچائی اور بے خوفی ہی تھی کہ 'الہلال' اور 'البلاغ' کی ضمانتیں ضبط ہوئیں، ان کے سلسلے میں مولانا نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، ملک بدر کیے گئے لیکن اپنے عقائد و نظریات کی ترسیل کے لیے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ جس خداداد صلاحیت، فکر و نظر اور فراستِ ایمانی سے بہرہ مند تھے اس کے بعد اس کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان کے کسی عزم، کسی عقیدہ اور کسی فیصلہ پر وقتی جذبات اور ظاہری ہنگاموں کا سایہ بھی پڑ سکتا ان کا ہر فیصلہ ٹھوس حقائق اور سنجیدہ غور و فکر پر مبنی ہوتا تھا۔

مولانا آزاد کی فراست اور ہند و پاک تعلقات

تقسیم ہند کے بعد ہی سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خاصے کشیدہ رہے ہیں خصوصاً گزشتہ دس پندرہ سال میں کشمیر کے مسئلہ کو لے کر دونوں ملکوں کے درمیان سرد جنگ کا سماں ہے ہندوستان اس معاملے پر ہمیشہ کھلے دل سے گفتگو کرنے کے لیے تیار رہا ہے اسی سبب اس سال کے اوائل میں وزیراعظم ہند محترم اٹل بہاری واجپئی نے پاکستان سے دوستانہ تعلقات کی جانب مزید پیش رفت کی اور بذریعۂ بس ہندوپاک کی سرحد عبور کر کے دونوں ملکوں کے درمیان دوری ختم کرنے کی کوشش کی۔ ریل اور ہوائی جہاز جیسے تیز رفتار اور جدید ذرائع آمد و رفت ہونے کے باوجود وزیراعظم ہند نے یہ فاصلہ بذریعۂ بس طے کیا گویا یہ سفر ایک علامت تھا زمینی فاصلوں کو کم کرنے کا۔ اس موقع پر پاکستان کے وزیراعظم نے ہندوستانی وفد کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور لاہور اعلانیہ پر دستخط بھی کیے لیکن

اعتراف

ان کے افکار کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ان کے معاصرین کو بھی تھا اور عصر حاضر کے ممتاز مفکرین و دانش وران کو بھی۔ مہاتما گاندھی کا یہ مختصر بیان "میں نے ان سے بڑا کوئی عقل مند نہیں دیکھا"۔ جہاں مولانا آزاد کی عظمت کا اعتراف ہے وہیں مولانا کی وفات پر پنڈت جواہر لعل نہرو کے یہ مختصر الفاظ "اب ہم کس سے مشورہ کریں گے" اس بات کے غماز ہیں کہ مولانا کی فراست اور دور بینی ملکی و غیر ملکی مسائل میں ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کی ہمیشہ معاون رہی۔ مولانا آزاد کے سانحۂ ارتحال پر علم و فکر کی دنیا میں ایک عجیب بے چینی پیدا ہو گئی۔ اس اندوہ ناک موقع پر ہندوستانی اور غیر ملکی مفکرین نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ مولانا آزاد کے نظریات کی افادیت کو سمجھنے میں مددگار ہیں۔ مشہور مصری مصنف ہیگل نے لکھا:

> "علم آج سیاہ پوش اور ماتم کناں ہے۔ علم کا شہسوار مرگیا اب دل و دماغ کی تشنگی کہاں سے بجھائی جائے گی"۔

برطانیہ کے عظیم فلسفی برٹینڈر رسل نے کہا:

> "یہ خبر سن کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں یکہ و تنہا رہ گیا ہوں۔ جیسے وہ دریا خشک ہو گیا جس کی موجوں سے ہمیں ذہنی و فکری سرور حاصل ہوتا تھا"۔

مولانا آزاد صدی تقریبات کے سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی افتتاحی

تک سرحد کے دونوں طرف مختلف مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے مسلمان نہ اس وقت یہ دعویٰ کر سکتے تھے اور نہ آج کر سکتے ہیں کہ آزاد مملکت حاصل کر کے انھوں نے اپنے تمام مسائل حل کر لیے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان آج بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف قوموں کے لوگ یعنی سندھی، پنجابی، بلوچستانی، پٹھان اور مہاجرین وغیرہ بستے ہیں لیکن یہ سب مل کر متحدہ حیثیت سے پاکستانی آج بھی نہیں۔

تقسیم ہند سے سرحد کے اس پار ہی مسائل پیدا نہیں ہوئے بلکہ ہندوستان بھی مختلف مسائل سے دوچار ہے۔ آج ہمارے ملک کی سالمیت کو مستقل طور پر خطرہ درپیش ہے۔ کبھی مذہب کے نام پر، کبھی زبان کے نام پر اور کبھی علاقے کے نام پر بعض اختلافات کے سبب الگ ریاست کی مانگ کی جاتی رہی ہے۔ صرف کشمیر ہی نہیں، پنجاب اور آسام میں آزاد مملکت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زور آزمائی ہمیں مولانا آزاد کے اس بیان کی طرف متوجہ کرتی ہے جس میں انھوں نے متحدہ قومیت کے تصور کو صرفِ نظر کرنے کے نتیجے سے خبردار کیا تھا:

> ''اگر ہم ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مختلف صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں روز بروز ایک نئی تفریق پروانشلزم کی بڑھتی جارہی ہے آپ یقین کیجیے یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلٹی کے لیے سخت مضر ثابت ہوگی''۔

بیساکھیوں پر کھڑی حکومت گر جاتی ہے۔ دوسری پارٹیاں مل کر اپنی سرکار بنانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن نظریاتی اختلاف کے باعث وہ بھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ نتیجتاً ایوانِ زیریں کو تحلیل کر دیا جاتا ہے اور عوام کو پانچ سال کے بجائے صرف اٹھارہ ماہ بعد پھر نمائندے منتخب کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ایسے بدترین وقت میں مولانا آزاد کا تصورِ قومیت ہی رہِ گم کردہ کو راست منزل تک پہنچانے میں مددگار ہے۔ غور طلب امر ہے کہ مولانا آزاد کا تصوّرِ قومیت صرف ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کی بات نہیں کرتا بلکہ تمام ہندوستان کے اتحاد کا پیغام دیتا ہے۔ وہ جب ایک قوم، ایک نیشن کی بات کرتے ہیں تو صرف کسی ایک فرقے کے دوسرے فرقے سے اتحاد کی بات نہیں کرتے بلکہ وہ تمام ہندوستانیوں کو متحد دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اگر ہندوستانیوں میں اتحاد ہوتا تو صرف ایک ووٹ کے فرق سے حکومت نہیں گرتی۔ ایک ممبر کی کمی سے لوک سبھا تحلیل ہونا جمہوریت کی کامیابی کا ثبوت نہیں بلکہ نمبر گیم کی ناکامی کی دلیل ہے۔ علامہ اقبالؔ نے جمہوریت کے متعلق کہا تھا ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس مین
بندوں کو گِنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

ہندوستانی پارلیمنٹ نے اپنے طرزِ عمل سے اس شعر کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔

آج کے اس بحرانی دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا آزاد کی

تقریر میں جدید دور میں مولانا آزاد کے افکار کی معنویت کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ بیان خاکسار کے اس مضمون پر دلیل کی حیثیت رکھتا ہے:

> "مولانا آزاد تحریکِ آزادی کے اور آزاد ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں تھے۔ افسوس ہے کہ تاریخ ایک ایسا موڑ مڑ گئی جو مولانا کے آدرشوں اور اصولوں کے خلاف پڑتا تھا اور یہ تو مستقبل ہی بتائے گا کہ یہ موڑ غلط تھا یا صحیح لیکن یہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ متحدہ قومیت ملے جلے کلچر، مذہبی رواداری، بھائی چارے اور ہندوستانیت پر فخر، وطنیت اور مذہب میں کسی ٹکراؤ کا محسوس نہ کرنا، دوسروں کے عقیدوں کا احترام، سچا سیکولرازم، وطن سے گہری محبت اور اس کی راہ میں حق پرستی، حق گوئی، حق طلبی اور حق شعاری کو آدرش بنانا، یہ تھی مولانا آزاد کی شخصیت اور ان اصولوں کی ضرورت جتنی آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے تھی اتنی ہی آج بھی ہے بلکہ آج پہلے سے بھی زیادہ ہے"۔

حقیقتاً آج زندگی کے ہر میدان میں خواہ وہ سماجی ہو یا سیاسی، تعلیمی ہو یا مذہبی، روحانی ہو یا مادّی، ملکی ہو یا غیر ملکی، ہم مسائل سے نبرد آزما ہیں۔ خصوصاً ہمارے ملک کی سیاست پر اتنا بُرا وقت آیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اور کہیں ایسا نہ ہوا تھا۔ جدید دور فرد کی طاقت کا دور ہے یہاں نظریات، عقائد اور جماعت کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ایک ووٹ کی کمی سے پارلیمنٹ میں

مولانا ابوالکلام آزاد اور آج کے مسائل

حنا

حضرت جناب مولانا ابوالکلام آزاد جن کا نام محی الدین تھا۔ ۱۸۸۸ء میں حجاز کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولانا خیر الدین اسلام کے بہت بڑے عالم تھے۔ مولانا آزاد ۱۸۹۰ء میں اپنے والد کے ساتھ کلکتہ آئے۔ ان کی ماں عربی النسل اور باپ ہندی الاصل تھے۔ عربی زبان مولانا کی مادری زبان تھی اور اردو پدری زبان۔ مولانا نے اپنے والد اور دوسرے عالموں سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۶ سال کی عمر میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی ملاقات سر سید احمد خاں سے ہوئی۔ اور ان سے History, Modern Science, Philosophy کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا کو عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا وہ اکثر فارسی کے مقولے کوڈ کیا کرتے تھے کلکتہ ہی میں Revolutionary Group میں شامل ہوگئے ۱۴ سال کی عمر میں ہی ان کے Articles رسالوں میں چھپنے لگے انھوں نے ایک اردو ہفتہ وار Al-Hilal نکالا۔ مولانا آزاد کہتے تھے کہ "آزادی حاصل کرنا بلا امتیاز مذہب و ملت، ہر شخص کا پیدائشی حق ہے" اللہ کی مخلوق کو کسی انسان کے ذریعے بنائے گئے

تحریروں کا از سرِ نو مطالعہ کیا جائے اور ان تحریروں میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ مولانا کی تحریروں میں جاگزیں اشارات اور علامات نہ انقلاب لا سکتے ہیں نہ حکومتیں بدل سکتے ہیں۔ لیکن انقلاب کے لیے فضا ضرور سازگار کر سکتے ہیں۔ بیج بو سکتے ہیں، تناور درخت مہیا نہیں کر سکتے۔ لیکن شرط قول وعمل میں تطابق کی ہے، شرط خلوص کی ہے، استناد کی ہے، نظر سے کام لینے کی ہے۔

بہترین مظاہرہ ہوا۔ اسی طرح محرم کے موقعہ پر معزز ہندوؤں نے پان، چائے اور سگریٹ سے مسلمانوں کی تواضع کی اگر یہ طریقہ جاری رہا تو ہندو مسلم جھگڑے باقی نہ رہیں گے اور غیر ملکی حکومت کو یہاں رہنے کے جواز میں ایک دلیل کم کرنی پڑے گی۔"

ہندو مسلم اتحاد کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے مولانا آزاد نے ہندوؤں کو "مشابہ اہل کتاب" کا درجہ دیا۔ یہ نہایت ہی اہم فیصلہ تھا، جس نے سماجی یگانگت کا ماحول پیدا کر دیا۔ اس کے سیاسی نتائج بھی دوررس تھے۔

مولانا آزاد اپنی پوری سیاسی زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو آل انڈیا خلافت کانفرنس کے دسویں اجلاس میں جو کناڈا میں ہوا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک قرارداد پیش کی تھی۔ رپورٹ میں ہے۔

"پھر مولانا آزاد نے ایک قرارداد پیش کی جس میں ہندو مسلم اتحاد کی تلقین تھی اور کہا گیا تھا کہ سب قوموں (مذاہب) کی عبادت گاہوں کا تحفظ کیا جائے۔"

۱۹۲۳ء میں یہ پہلا موقع تھا کہ ۳۵ سال کی عمر میں مولانا آزاد کو ایک پکا Nationalist ہونے کے ناطے (INS) کا President بنایا گیا۔ یہ بہت حیرت کی بات ہے کہ ایک اقلیتی فرقہ کے فرد کو (INS) کا President بنایا گیا۔ ان کی صلاحیتوں کی بنا پر ہی ایسا کیا گیا تھا۔

مولانا آزاد ایک پکے نیشنلسٹ اور بے داغ محبِ وطن تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے گاندھی جی کو قوم کا رہنما سمجھا تھا اور ہر نازک مرحلہ میں ان کا

قانون کا پابند کرنا کسی کا حق نہیں ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''یہ میرا پیدائشی حق ہے کہ اپنے ملک کو انگریزی حکومت سے آزاد کراؤں''۔

مولانا آزاد کہتے تھے کہ ''ہندوستان کی مٹی پر جتنا حق ہندو مذہب کو ماننے والوں کا ہے اتنا ہی اسلام کے ماننے والوں کا ہے جس طرح سے ایک ہندو بھائی فخر اور شان سے کہتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندوازم کا ماننے والا ہے اسی طرح فخر اور شان کے ساتھ ایک مسلمان اسلام کا علمبردار ہے''۔ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ ہماری ۱۱۰۰ سالہ Common History نے مشترکہ طور پر بہت کچھ حاصل کیا ہے ہماری زبان ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری تہذیب، ہماری پوشاک، ہمارے طور طریقے اور دوسری روز مرہ واقع ہونے والی چیزیں ہماری روزمرہ کی زندگی پر اثرانداز ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے مولانا آزاد کے بارے میں کہا ہے کہ ''مولانا آزاد ایک خالص مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پکے Nationalist بھی تھے وہ ملک کا مفاد پہلے سوچتے تھے میں نے ان کو بہت سی بار مسلم عقیدہ سے عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے ملک کے لیے کوئی قربانی دینے کے لیے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے''۔ خلافت عدمِ تعاون کی تحریکوں میں ہندو مسلم اشتراکِ عمل نے فرقہ وارانہ یکجہتی کی عجیب و غریب فضا پیدا کردی تھی۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے Independent Allahabad نے نینی تال میں رام لیلا کے جلوس کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ''نینی تال میں مسلمانوں نے رام لکشمن اور سیتا کے جلوس پر ہار ڈالے اور دونوں مذاہب میں یک دلی کا

لڑنے کے لیے تیار ہے اور کوئی اپنے گھر کی حفاظت کر کے کسی سے وفاداری کا سرٹیفکٹ نہیں لیتا۔

ہندو مسلم مسئلہ کی جو نوعیت تقسیم سے پہلے تھی اس سے کہیں زیادہ خطرناک صورت اس نے آج اختیار کر رکھی ہے۔ ہندوؤں کی تحریک نے شاید یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں سے کوئی سروکار نہیں رکھے گی۔ انھیں معاشی اور سماجی اعتبار سے ذلیل رکھے گی۔ اگر بس میں ہوا تو اس ملک میں ان کا نام و نشان نہ چھوڑے گی۔ مولانا آزاد نے ہندو انقلابیوں کو کہا تھا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت کو اپنا مخالف نہ سمجھیں، انھیں اپنا دوست بنائیں۔ ان کی تائید اور دوستی کے بغیر آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت زیادہ دشوار ہو جائے گی۔ آج مولانا آزاد کے نام پر لیڈروں کی تحریکوں سے اپیل کی جا سکتی ہے کہ آزادی کو قائم رکھیے اور اسے بامقصد اور بامعنی بنانے کے لیے وہ مسلمانوں کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لیں، ان پر اعتبار کریں، انھیں اپنا ساتھی اور دوست سمجھیں۔ کروڑوں انسانوں کی اس جماعت کو اور پست رکھ کر ملک اور قوم کا نام اونچا نہیں کیا جا سکتا۔ ملک اور قوم کی آبرو اور آزادی باقی نہیں رکھی جا سکتی۔

ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کی مثال ہندوستان میں ہوئے فسادات کے موقعے پر ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہر جگہ اس طرح کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جہاں ہندو بھائیوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کی جان کی حفاظت کی ہے۔ اور اسی طرح مسلمان اکثریتی علاقوں میں ہندو بھائیوں بہنوں کو بچایا گیا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے دونوں فریق ہندو اور مسلمان ایک جگہ بیٹھیں اور اپنے

ساتھ دیا تھا۔ برسوں کانگریس کے صدر اور پوری ہندوستانی قوم کا ذہن و ضمیر بنے رہے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ ''اگر کوئی مجھ سے کہے کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر سوراجیہ مل سکتا ہے بشرطیکہ میں ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جاؤں تو میں سوراجیہ سے محروم رہنا پسند کروں گا لیکن ہندو مسلم اتحاد سے کسی قیمت پر نہیں۔ کیوں کہ سوراجیہ ملنے میں تاخیر ہو جائے تو ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد ختم ہو جائے گا تو یہ ساری انسانیت کا نقصان ہوگا''۔

مولانا آزاد کو گاندھی جی سے بہت لگاؤ تھا۔ ۱۵/ اگست ۱۹۴۱ء کو مولانا نے واردھا میں کہا تھا کہ ''ہم کوئی بھی ستیہ گرہ بنا گاندھی جی کی مرضی کے نہیں کر سکتے ہم مہاتما گاندھی کو اپنا سب سے بڑا لیڈر مانتے ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے ان کی عزت کرتے ہیں ان سے بڑا کوئی بھی نہیں'' انھوں نے شملہ کانفرنس میں کہا تھا کہ ''ہم انگریزی حکومت کا پوری طرح ساتھ دے سکتے ہیں اگر وہ ہم کو آزاد کر دیں'' مولانا نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی۔ مولانا آزاد ہمیشہ سے ہندوستان کے بٹوارے کے خلاف تھے کیوں کہ مسلمانوں نے اپنے لہو سے اس چمن کو سینچا ہے اپنے وطن کو سنوارا ہے۔ اپنی حب الوطنی یا وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے وہ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ اسے اپنے مادرِ وطن کی آبرو کا پاس ہے۔ کیا کوئی باغبان اپنے باغ کو اجڑتے ہوئے دیکھ سکتا ہے؟ کیا کوئی مکین اپنے مکان کو جلتے یا بربادی میں بدلتے ہوئے دیکھ سکتا ہے؟ یہاں کا مسلمان کیسے اپنے زمین کو بنجر ہوتے، شعلوں میں بدلتے دیکھ سکتا ہے۔ یہ اس کا اپنا گھر ہے اس لیے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے کسی بھی بیرونی طاقت سے

کے دو حصے ہیں جن کا ایک دوسرے سے مسلسل رابطہ ناگزیر ہے۔ جیسے کبھی کبھی دو جڑواں بھائیوں کے درمیان دماغی لہروں کا تعلق قائم رہتا ہے چاہے وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بلکہ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وقت کے طویل سلسلہ میں جو تغیرات رونما ہوئے ان میں یہ دونوں ملک بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ایسی حالت میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے جدا کیسے ہو سکتے ہیں؟

حضرت مولانا شمس نوید عثمانی لکھتے ہیں کہ "ہندو دنیا کی سب سے پہلی شریعت والی قوم ہیں اور مسلم آخری شریعت والی قوم۔ اور ان دونوں کو حکمت الٰہی نے ایک ہی ملک ہندوستان میں اکٹھا کر دیا ہے۔ ہندوستان کے تمام مندر اور مسجد شرقاً غرباً یعنی قبلہ رو تعمیر ہوئے۔" ڈیوبائس اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔ "بڑے بڑے منادر کا طرز تعمیر اور ڈھانچہ خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے ہر جگہ بالکل ایک اور یکساں ہیں۔ داخلہ کا صدر دروازہ پورب کی سمت میں نکلتا ہے اور یہ ایک ایسی نوعیت ہے جس کا پورا لحاظ ان کے تمام منادر اور مساجد میں کیا گیا ہے۔ چاہے وہ بڑے ہوں یا چھوٹے۔"

مسلمانوں کو مسجدوں کی سمت تعمیر کی وجہ معلوم ہے۔ لیکن ہندو نہیں جانتے کہ انھوں نے کیوں اپنے مندر قبلہ رو تعمیر کیے ہیں۔ مختلف لوگ مختلف توجیہات کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن صحیح علم کسی کو نہیں ہے۔ کہیں یہ ان کے کعبہ سے دیرینہ تعلق کی بنا پر تو نہیں ہے جسے وہ آج بھول گئے ہیں اور اب خالی رواج باقی رہ گیا ہے اور حقیقت کھو گئی ہے۔

مسائل ایک دوسرے کے ذریعے اور تعاون سے حل کریں۔

میرے والد محکمۂ سینچائی میں ملازم ہیں اور ہم لوگ نہر بائی کی کالونی میں رہتے ہیں، جہاں اکثریت ہندو بھائیوں کی رہی ہے۔ مسلمان ملازمین ہر جگہ دو (۲) فیصد سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے یقین نہ آئے بجنور جاکر ۱۹۹۰ء کے بجنور فساد کے موقعے پر شہر سے ۳ کلو میٹر دور بیراج روڈ پر کینال کالونی کا حال معلوم کرلیجیے جہاں صرف ۴ فیملی مسلمان تھیں باقی سب ہندو بھائی تھے۔ شہر میں ہوئے دنگوں کے دوران مختلف کالونیوں میں بسے اکادکا مسلمان اپنے اپنے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ صرف نہر بائی کالونی ایسی تھی جہاں چاروں فیملی سے ایک بھی کہیں نہیں گیا تھا۔ بلکہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل جل کر اپنی کالونی کی حفاظت کی۔

آج بھی ہم اوکھلا کینال کالونی میں جہاں تقریباً ڈیڑھ سو کوارٹر بنے ہوئے ہیں، تین چار مسلمان فیملی اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پیار محبت سے رہتے ہیں۔ شادی بیاہ یا غمی کے موقعے پر شریک ہوتے ہیں اور ہر وقت ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے کو تیار رہتے ہیں۔

ہندوستان اور عرب کا زمانۂ قدیم سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۲۰ کروڑ سال پہلے زمین کے تمام براعظم آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے جنوب کا کنیا کماری کا علاقہ عرب کے عدن کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اور ہندوستان کے درمیان تجارتی، ثقافتی اور روحانی تعلقات پر مبنی لٹریچر بھرا پڑا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی کمپیوٹر مشین

مسلمانوں کا مقسوم بن کر رہی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، کانگریس اور مسلم لیگ کسی نے ان کی بات نہیں مانی اور انھوں نے محسوس کیا کہ تن تنہا وہ ایک ایسے چٹیل میدان میں کھڑے ہیں جہاں ان کا کوئی ساتھی نہیں۔ وطن میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

مولانا نے اس بات کو بھی نمایاں اور واضح کیا ہے کہ ”قرآن نے انسان کے لیے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی بنیاد بھی تمام کارخانۂ ہستی کی طرح تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی گئی ہے۔“ پھر قرآن نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی ہے کہ ”خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے اور سچی عبادت ہے۔ جس کے لیے معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو“ لیکن بندے کے لیے خدا کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ (قرآن) کہتا ہے کہ: خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے گذری ہے جو انسان چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے اسے چاہیے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

جب جب ملک کو مسلمانوں کے خون کی ضرورت پڑی ہے مسلمانوں نے اپنا لہو دے کر مادرِ وطن کی آبرو بچائی ہے۔ آج پھر جب مادرِ وطن کو لہو کی ضرورت پڑی تو حنیف الدین نے اپنا لہو اپنی مٹی کے حوالہ کر دیا۔ وطن سے سچا عشق کرنے والے سیکڑوں جاں باز مسلم نوجوانوں نے ۹۰ کروڑ ہندوستانیوں کی زندگی کی شمع کو روشن رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ آج شہید حنیف الدین کی طرح ان شہیدانِ وطن میں جانسٹھ مظفر نگر کے رضوان تیاگی۔ ہردوئی کے عابد خاں۔ ملیانہ میرٹھ کے زبیر احمد۔ غازی پور، یوپی کے اسحاق خاں۔ متھرا کے

ہندوؤں کی چتا کا رخ شمالاً جنوباً ہوتا ہے اور یہی مسلمانوں کی قبروں کا رخ ہے۔ مسلمانوں حج وعمرہ کے موقع پر کعبہ کے سات طواف کرتے ہیں۔ ہندو شادی بیاہ کے موقع پر اگنی کے سات پھیرے لے کر عہد کرتے ہیں۔ مسلمان حج کے موقع پر جو لباس (احرام) پہنتے ہیں وہ دو عدد بغیر سلی چادروں پر مشتمل ہوتا ہے ایک تہہ بند کے طور پر باندھی اور دوسری اوڑھ لی جاتی ہے۔ ہندو تیر تھ کے موقع پر ہزاروں سال پہلے ہی سے یہی لباس زیب تن کرتے چلے آرہے ہیں۔ بلکہ یہ لباس ان کے یہاں اتنا مقدس مانا جاتا ہے کہ اس کی بدلی ہوئی شکل عام زندگیوں میں مردوں نے دھوتی اور عورتوں نے ساڑی کی شکل میں اپنالی ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا آزاد تقسیم کے مخالف تھے۔ اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ تقسیم نہ تو مسلمانوں کے لیے مفید ہے اور نہ ملک کے لیے۔ اور اس سے مسائل اتنے حل نہ ہوں گے جتنے کہ پیدا ہوں گے۔ آج اس صدی کے اخیر میں جب ہم تقسیم کے خلاف مولانا کے دلائل پر غور کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کی رائے کتنی صحیح اور ان کے دلائل کس قدر وقیع تھے۔

مسلمانوں سے وہ کہتے تھے کہ تقسیم میں تمھاری اور اس ارتقاپذیر مشترک قومی تہذیب و ثقافت کی تباہی ہے، جسے صدیوں میں ہمارے بزرگوں ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا ہے۔ کانگریس میں وہ ملک کی وحدت کی بنیادی اہمیت اور ملک و قوم کے حق میں تقسیم کے دور رس اور خطرناک نتائج پر نظر رکھنے کی تلقین کرتے تھے اور اس خوں ریزی و حشت، بربریت اور تباہی و بربادی سے آگاہ کرتے تھے جو آخر کار تقسیم کے جنون میں ہندوؤں اور

مرحوم نے اس زمانے میں اپنی کوشش اور بھاگ دوڑ کر کے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ دہلی بنادیے لیکن ان دونوں اداروں کی حالت ہمارے سامنے ہے۔ آئے دن اسٹرائک یونی ورسٹی بند کرنے کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ان یونی ورسٹیوں میں Higher education یا Profetional Courses کا ہر سال کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ کتنے لڑکے لڑکیاں مسلمان اور کتنے غیر مسلم۔ مسلمان اس بات کا رونا کرتے ملیں گے کہ ہم کو داخلہ نہیں ملا۔ لیکن اپنی قابلیت اور نالج پر غور نہیں کرتے۔ یونی ورسٹی اتھارٹی پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ غیر مسلموں کے داخلے زیادہ کیوں ہو رہے ہیں۔ غیر مسلم لوگ اپنی قابلیت اور محنت کی بنا پر Written Test اور انٹرویو میں Sellect ہوتے ہیں۔ مراد آباد اور میرٹھ کی مثال سامنے رکھیے جہاں ہندو مسلم آبادی کا تناسب تقریباً پچاس فیصدی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل مراد آباد میں ایک انٹر کالج مسلمانوں اور چار پانچ کالج ہندوؤں کے تھے۔ آج ہندوؤں کے انٹر کالج گلی کوچوں میں لاتعداد ہیں لیکن مسلم ایک سے بڑھ کر دو تین سے زیادہ نہ ہوئے۔ جب کہ آبادی برابر کے تناسب سے بڑھی ہے۔ دو سال قبل مراد آباد کے مسلم انٹر کالج میں جناب مفتی آصف جو کہ وہاں کے منیجر ہیں کی کئی سال کی کاوش اور محنت کے بعد ڈگری کلاس شروع ہوئی ہیں۔

مراد آباد جیسی جگہ میں مسلمانوں کے پاس پیسہ کی کمی نہیں ہے۔ سارے مسلمان مل کر اگر چاہیں تو ایک نہیں دو دو ڈگری کالج چلا سکتے ہیں، کمی اگر ہے تو پڑھنے والوں کی۔ ایک یہ عام خیال ہوتا ہے کہ پڑھ لکھ کر کہیں نوکری تو ملتی نہیں

حسن علی۔ آگرہ کے حسن محمد۔ مین پوری کے امیر الدین۔ فرید آباد کے زبیر احمد۔ پانی پت کے ریاست علی۔ گڑ گاؤں کے ذاکر علی۔ جموں کے حوالدار عبدالکریم اور خورشید جیسے سیکڑوں مسلم بچے ہیں جنھوں نے دشمن سے لڑتے ہوئے اپنی جان آفریں کے سپرد کردی۔ ان ناموں کے ساتھ سیکڑوں اور بھی نام جوڑے جاسکتے ہیں، جنھوں نے وطن کی سالمیت کی خاطر اپنی جان قربان کردی اور سیکڑوں ایسے ہیں جو اب بھی وطن کی حفاظت کے لیے محاذ جنگ پر ہیں اور مسلم جاں باز سپاہیوں نے شجاعت و بہادری کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ جنگ کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

دوسرا مسئلہ مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان ہے۔ سر سید احمد خاں نے آزاد کو جو راہ دکھائی تھی اس میں آئندہ کے مسائل کا حل بھی پنہاں تھا۔ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار سر سید نے کہا تھا۔ ''اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے جو خواہ مخواہ طاعاً و کرھاً ہم کو دلادے گی۔ بس کسی بھی ضلع ہیڈ کوارٹر کا جائزہ لیجیے تو بمشکل تمام اگر ہوا تو ایک انٹر کالج جو ۱۹۴۷ء سے قبل کا ہی قائم کیا ہوا ہوگا ملے گا۔ اس پچاس سال کے عرصے میں وہ انٹر کالج سے بڑھ کر ڈگری کالج نہ بنا ہوگا۔ مسلمان اکثریتی والے علاقوں میں یہ حالت ملے گی جہاں اقلیت میں ہیں وہاں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مراد آباد، میرٹھ، بجنور، کانپور، اعظم گڑھ وغیرہ سب جگہ ایک سی حالت ملے گی۔'' کیا وجہ ہے مسلمانوں میں تعلیم پر اب تک توجہ کیوں نہیں دی جارہی ہے۔ سر سید احمد خاں مرحوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین

ظاہر ہے محنت کرنے سے جی چراتے ہیں، سفارش سے داخلہ کرانا چاہتے ہیں۔
سر سید کا مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ جس کی تائید مولانا آزاد نے کی کہ وہ مغربی تعلیم پر توجہ مرکوز کریں، بلاشبہہ صحیح تھا۔ اس کے بغیر وہ نئے طرز کی قومیت کی تشکیل میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ہندوؤں کے حاشیہ بردار بن جاتے کیوں کہ ان کی تعلیمی حالت بہتر تھی اور اقتصادی حیثیت تو کہیں زیادہ مضبوط تھی۔

تیسرا مسئلہ اردو کا ہے -: اردو کا حال یہ ہے کہ مسلمان گھرانوں میں ہمارے بچے اردو پڑھنا نہیں چاہتے۔ کانونٹ اسکول میں انگلش میڈیم سے تعلیم حاصل کرتے ہیں کہتے ہیں اسکول میں اردو ہے ہی نہیں کہاں پڑھیں۔ جہاں اردو پڑھانے کی Facility ہے وہاں کا ادارہ کہتا ہے دس پندرہ بچے بھی ہو جائیں تو ہم اردو ٹیچر رکھ لیں۔ لیکن مسلمانوں کے بچے ہیں اردو پڑھنے سے بھاگتے ہیں۔ میرے بھائی نے بجنور گورنمنٹ انٹر کالج میں ۱۹۸۵ء میں چھٹی کلاس میں داخلہ لیا اور اردو بھی لی۔ پورے کلاس میں صرف سات آٹھ بچوں نے اردو لی جس میں آپ کو حیرت ہو گی، چار بچے غیر مسلم بھی تھے وہ بچے اردو اس لیے پڑھ رہے تھے کہ ان کو معلوم تھا آگے چل کر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں بغیر اردو کے داخلہ مشکل سے ہو گا۔ لیکن ہمارے مسلمان بھائیوں کی یہ سوچ نہیں ہے۔ جن مسلمان بچوں کو جامعہ میں داخلہ مل جاتا ہے اور ایک پرچہ اردو کا سامنے آتا ہے بڑے فخر سے کہتے ہیں اردو تو ہم نے پڑھی ہی نہیں اب کیا کریں۔
مسلمان تعلیم پر خرچ کو فضول خرچی سمجھتے ہیں۔ جب داخلہ کا معاملہ آتا ہے

ہے اس پڑھائی سے کیا فائدہ کیوں نہ کوئی کاروبار شروع ہی سے کریں۔ یہ سوچ بہت غلط ہے۔ مولانا آزاد کی زندگی پر سرسید احمد خاں کا بہت اثر پڑا۔ چوں کہ مولانا آزاد کے سامنے خود ان کے والد سرسید اور ان کے خاندان کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ سرسید کے عظیم الشان علمی اصلاحی اور سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ ''مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا۔ اور اس کے ارد گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔''

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے سینئر سیکنڈری اسکول کے ایک لیکچرر جو وائس پرنسپل سے ابھی ریٹائر ہوئے ہیں۔ شکیل اللہ خاں جو کہ مراد آباد کے باشندے ہیں، ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں بتانے کے لیے مراد آباد جاتے ہیں۔ وہاں کے باشندوں سے مشورہ کرنے کے بعد ایسا پروگرام بنایا کہ ہر سال جامعہ میں ڈپلوما اور ڈگری انجینئرنگ کے لیے کافی بچے امتحان دینے آتے ہیں اور Sellect نہ ہونے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں انھوں نے Proposal رکھا کہ کیوں نہ وہاں ایک ڈیڑھ ماہ کا کوچنگ کلاس لیا جائے جس میں بچوں کو ڈپلوما اور انجینئرنگ وغیرہ کی تیاری کرائے جائے۔ اس کام کے لیے دو تین ٹیچرس کو بھی انھوں نے تیار کر لیا تھا جو فی سبیل اللہ بغیر کسی اجرت کے پڑھانے کو تیار تھے اور وہاں جا کر رہے بھی۔ ان دو تین آدمیوں کے رہنے سہنے کا انھوں نے خود بندوبست کیا۔ لیکن اس کا کیا ہو سکتا ہے کہ اس کوچنگ میں کوئی بچہ پڑھنے کے لیے نہیں آیا۔ ایسا کیوں؟ صاف

ہیں تو وہ یہ اس لیے نہیں کہتے کہ ان کو ہندی کی محبت ہے بلکہ اس لیے کہ وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ دوسری کوئی زبان آگے بڑھے۔ یہ جذبہ کام کر رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اپنا قد اونچا کر لیجیے۔ لیکن آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ دوسرا ٹھگنا ہو جائے۔ اپنے قد کو اونچا کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دوسروں کو ٹھگنا بنایا جائے۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نارتھ انڈیا میں نہیں ہے جو کہ ہندی کی ترقی نہ چاہتا ہو یا ہندی کا مخالف ہو۔"

ابھی حال ہی میں گزشتہ ۲۲/جولائی ۱۹۹۹ء کو حکیم عبدالحمید صاحب کا دہلی میں انتقال ہوا ہے جنھوں نے تنہا اپنی کوشش سے ہمدرد یونی ورسٹی، ہمدرد کالج آف فارمیسی، ہمدرد طبیہ کالج، مجیدیہ ہاسپٹل، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری اینڈ میڈیکل سائنس قائم کیے۔ یہ سب تن تنہا ان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے کسی شخص کسی تنظیم سے کوئی مدد کبھی بھی حاصل نہیں کی۔

۱۹۴۲ء میں پنڈت نہرو نے مولانا آزاد کے متعلق لکھا تھا کہ "ہم لوگوں نے بعض اوقات ہندوستانی زندگی کی رنگا رنگی میں ٹکراؤ محسوس کیا ہے لیکن وہ (مولانا آزاد) اتنے اعلیٰ ظرف ہیں کہ ان کو نہ صرف اس رنگا رنگی کے پیچھے بنیادی وحدت نظر آتی ہے بلکہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وحدت میں پورے ہندوستان کا شاندار مستقبل ہے اور ہندوستان کی رگوں میں جو مختلف قومیں کام کر رہی ہیں ان کی منزل بھی یہی ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا سے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ

کسی اچھے اسکول میں دلانے کا تو اس لیے نہیں جاتے وہاں کہ خرچہ زیادہ ہوگا۔ سرکاری اسکولوں میں داخلہ کی کوشش کرتے ہیں جہاں فیس کم ہوتی ہے ہمارے ہندو بھائی اور ساتھی اچھے سے اچھے اسکول میں خرچے کی پرواہ کیے بغیر داخلہ لیتے ہیں اور ایک کثیر سرمایہ پڑھائی پر خرچ کرتے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں جب کہ مولانا آزاد ایجوکیشن منسٹر تھے۔ شبلی اکیڈمی کو (جو کہ اردو زبان کی کتابیں شائع کرتی تھی اور اس کی کتابوں کو گاندھی جی نے بھی پسند کیا تھا اور اس کی سرپرستی کی تھی اور کئی آرٹیکل اس کے متعلق لکھے تھے بہر حال شبلی اکیڈمی نے اردو زبان میں ایک مفید اور قیمتی کام کیا تھا) ۶۰،۰۰۰ ہزار روپیہ کی رقم گورنمنٹ کی طرف سے دی گئی اس پر سب لوگوں نے بہت شور اور واویلا مچایا کہ اردو کی ترقی کے لیے پیسہ کیوں دیا گیا۔ اس کے جواب میں مولانا نے پارلیمنٹ میں ۲۹/مارچ ۱۹۵۴ء کو اپنی کافی طویل تقریر میں کہا تھا کہ "اردو زبان کسی ایک مذہبی گروپ کی زبان نہیں ہے جو لوگ اس کو بولتے ہیں اس میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی ہیں اور عیسائی بھی ہیں۔ صرف مسلمان ہی نہیں۔ پھر بھی آخر ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں بستے ہیں۔ اگر اس سوسائٹی کو جو اردو زبان کی ایک قیمتی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ایک مرتبہ ۶۰،۰۰۰ روپیہ دیے ہیں تو یہ کون سی ایسی چیز ہے جس کو اس قدر محسوس کیا جائے اور یہ شکایت کی جائے کہ یہ اسلامک کلچر کی ترقی کے لیے کیا جارہا ہے۔ یہ جو انھوں نے اس کی شکایت کی تو کیا اس وجہ سے کہ ان کو ہندی کی محبت ہے نہیں، ہندی سے کس کو اختلاف ہے؟ ہندی کی محبت میں اور ہندی کو ترقی دینے میں تو سب ایک رائے

مولانا ابوالکلام آزاد اور آج کے مسائل

راشد میاں

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردا فگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلہ میرے بعد

مولانا ابوالکلام آزاد بلا شبہ ایک نابغۂ روز گار شخصیت تھے، ایک ایسی شخصیت جو رنگارنگ تھی اور منفرد و ممتاز بھی، دل نشیں بھی تھی اور حد درجہ دلنواز بھی، پر وجیہہ بھی تھی اور نہایت پر وقار بھی۔ مولانا فقید المثال عالمِ دین، بے عدیل سیاست داں، لائق و فایق فلسفی، قابلِ قدر صحافی، عظیم مفکر، بلند پایہ مفسر، صاحبِ طرز ادیب، جادو بیان خطیب اور بہترین انشا پرداز تھے۔ ان کی ایک شخصیت میں کئی شخصیتیں پوشیدہ تھیں۔ اسی لیے انھیں مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام کہتے ہیں کہ: "ان کی شخصیت ایک طرح کا مثلث ہے جو سیاست، ادب اور مذہب کے زاویوں میں جلوہ گر ہوتی ہے"۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کہا ہے کہ "مولانا آزاد مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے"۔

اکثریت اور اقلیت کے جھگڑے میں نہ پڑیں اور تحفظات کے سارے تصورات بالائے طاق رکھ کر سیاسی تحریک میں شریک ہو جائیں ایک بار کہا۔ ''ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ ہندو میجارٹی کے عفریت کا خوف اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں القاء کیا گیا''

۱۹۲۲ء میں ایک عدالتی بیان میں کہا: ''گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو حکومت قائم ہو جائے گی۔ مگر ''الہلال'' نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔

اس وقت موجودہ دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان مولانا کے اس مقولہ کو گرہ میں باندھ لیں اور اس پر عمل کریں ''اگر آپ چاہتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اپنا قد اونچا کر لیجیے۔ آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ دوسرا ٹھگنا ہو جائے'' اس ایک جملہ میں مسلمانوں کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ کسی بھی فیلڈ یا فیکلٹی میں جائیں چاہے تعلیم ہو، سروس ہو، تجارت ہو، کوئی کارخانہ ہو، کسی کمپٹیشن میں جانا ہے یا جو بھی کام آپ کریں اپنا قد، اپنا مقام سب سے اونچا رکھنے کی کوشش کیجیے کردار کے غازی بنیں گفتار کے غازی نہیں۔

زمانہ ہم کو مٹا سکے زمانہ میں یہ دم نہیں
زمانہ خود ہم سے ہے زمانے سے ہم نہیں

عندلیبِ گلشن ناآفریدہ ہوں"۔ اسی طرح انھوں نے ایک جگہ اپنے وجود کو ایسا ثمر قرار دیا ہے جو فصل سے قبل تیار ہو گیا ہو۔ اسی لیے ڈاکٹر کامل قریشی نے صحیح نتیجہ اخذ کیا۔ "مولانا کو شدید احساس تھا کہ وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے اور انھیں سمجھنے والا زمانہ آگے آئے گا"۔ مولانا کے احساسات و مدرکات پر مبنی یہ تمام باتیں نہ صرف دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں اور بحث و مباحثہ کی گرہیں کھولتی ہیں بلکہ ان کے افکار و نظریات کا واضح تصور بھی پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانہ میں مذہب، ادب اور سیاست کے مثلث پر جس بالغ نظری اور فکری اصابت سے اپنے لازوال کارناموں کے نقوش چھوڑے وہ عصر حاضر میں تقدیم پارینہ سمجھ کر بھلائے نہیں جاسکتے اور نہ انھیں نقش و نگار طاقِ نسیاں سمجھ کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے افکار و خیالات عصری مسائل کے لیے اکسیر ثابت ہو سکتے ہیں اور ہندوستان کے جمہوری نظام کے استحکام اور قومی کردار کی بحالی میں مددگار بھی بن سکتے ہیں۔ عصری تناظر میں ہر مسئلہ پر ان کے تشخص کی معنویت نئے امکانات روشن کرسکتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے بنیاد گزاروں اور معماروں میں تھے۔ انہی کے افکار و نظریات پر جدید ہندوستان کی تعمیر ہوئی تھی۔ لہٰذا اس عمارت کے استحکام اور مزید تعمیر میں ان کے افکار و نظریات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ آج آزاد ہندوستان جن متعدد، پریشان کن مسائل و بحران سے دوچار ہے ان مسئلوں کا حل بھی بیشتر آزاد کے افکار و خیالات میں پوشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں کا بیان ہے کہ:

"آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام کی مشین ایک ایسی کار

اور سید حامد کی نظر میں...... "مولانا آزاد کی شخصیت ہشت پہلو ہے"۔

سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور ہمہ صفت تھی کہ ایک الف لیلوی کردار کی طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان سے وابستہ حقائق الف لیلیٰ کی طرح داستانیں معلوم ہوتی ہیں اور داستانیں، ان سے منسوب ہو کر حقیقتیں بن گئی ہیں۔ ان کی ڈرامائی اور مقناطیسی شخصیت پر محافظ حیدر کا یہ تجزیہ بہت صحیح اور مناسب ہے۔" جب میں نے ان کے حالات، ان کے کردار اور کارناموں کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کیا تو مجھے ان کا کردار اور زندگی کے حالات سنیماٹک لگے۔" اس طرح کی شخصیتوں میں جبلی طور پر ایسا خمیر رچا بسا ہوتا ہے کہ وہ ہر شعبۂ حیات میں اپنے تشخص کی چھاپ چھوڑ جاتی ہیں۔ مولانا کی تحریریں اور تقریریں اس بات کے شواہد پیش کرتی ہیں کہ ان کی شخصیت اور ان کا پیغام "حدیثِ دیگراں" نہیں ہے بلکہ "سرِ دلبراں" ہے اپنی شخصیت اور انفرادیت کے بارے میں انھوں نے جگہ جگہ اشارے دیے ہیں۔ "غبارِ خاطر" میں انھوں نے ایک جگہ تفصیل سے لکھا ہے:

"مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا"۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں"۔ افسوس ہے زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا"۔ گویا غالبؔ کی زبان میں کہہ رہے تھے کہ "میں

باک صحافی بھی تھے لہٰذا ان کے افکار و اقوال کا بافہم مطالعہ و استفادہ آج کی تاریک راہوں اور پژمردہ ماحول کے لیے حیاتِ نو کی بشارت ہو سکتا ہے۔

آزؔاد کے ہمعصر خواجہ غلام السیدین اُن کی روشن دماغی سے متعلق رقم طراز ہیں۔ ''قدرت نے انھیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے۔ اور اُن کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے ماحول کا تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں الجھتے، موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے۔ لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملے تک پہنچ جاتی۔ اور وہ واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ اُن کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسہ تھا۔

(ایوانِ اردو، ابوالکلام آزاد نمبر ۱۹۸۸ء دہلی ص ۱۹۵)

لیکن زمانہ ماضی و حال ان کی اس روشن دماغی اور بے پناہ ذہنی صلاحیتوں سے ملک و قوم کے شدید مسائل حل نہ کرا سکا۔ آزؔاد کو خود اس بات کا احساس تھا۔ چناں چہ اپنے ایک مکتوب بنام غلام رسول مہؔر میں انھوں نے لکھا ہے:

''افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالؔب کو تو صرف اپنی شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ کتنی چیزیں قبر میں جائیں گی''۔

(غالؔب اور ابوالکلام آزاد: مرتبہ عتیق صدیقی، مکتبہ شاہراہ،

ہے جو آزادؔ کے نظریات و افکار کے کارخانے میں تیار ہوئی
تھی۔ اس کار کی کارکردگی برقرار رکھنے کے لیے آزاد کے
افکار و خیالات وہ ''پرچہ ترکیب استعمال'' ہیں جن کی ہدایات پر
عمل کیے بغیر ملکی، جمہوری اور سیکولر نظام کی یہ کار بے کار
ہو سکتی ہے''۔ (بحوالہ جرنل عربک اینڈ پرشین ریسرچ
انسٹی ٹیوٹ ٹونک ۱۹۹۸ء جلد ۱۳)۔

یہاں سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ماضی و حال کے ماحول و مسائل، افکار و خیالات میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ حال کی جڑیں ماضی کی گہرائیوں میں ہی پوشیدہ ہوتی ہیں اور عہدِ حاضر کو ماضی کے حوالے کے بغیر ٹھیک طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ کسی بھی ملک و قوم کا حال و مستقبل ماضی کی بنیادوں پر ہی صحیح طور پر تعمیر ہوا کرتا ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''ماضی کبھی بالکل رخصت نہیں ہوتا یہ حال میں چھپ
چھپ کر ظاہر ہوتا رہتا ہے اور برابر اسے متاثر کرتا رہتا ہے۔
یہ ہمارے مستقبل کو بھی بناتا بگاڑتا ہے۔ اسی لیے ماضی کے
پارینہ قصوّں کو بھی کبھی کبھی دہراتے رہنا چاہیے''۔ (رسالہ
ایوانِ اردو، ابوالکلام آزاد نمبر، دسمبر ۱۹۸۸ء، دہلی ص
۳۲۔۳۴)

مولانا آزادؔ کو قدرت نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا اور وہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک بھی تھے۔ پھر وہ مفکر، قد آور دانشور، باشعور سیاسی رہبر اور ایک بے

اس پر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں"۔[1]

آج بھی ہندوستان کے چند اہم مسئلوں میں ہندو مسلم تنازعے فرقہ وارانہ تعصّبات، مختلف علاقائی تہذیب اور مختلف علاقائی زبانوں میں باہم مخالفت وغیرہ اہم مسائل ہیں۔ آزاؔد نے اپنے عہد میں ہی حال و مستقبل کے ان اہم مسائل کی جانب نہ صرف اپنی توجہہ مبذول کی تھی بلکہ ان مسائل کے حل بھی پیش کیے تھے۔ آزاؔد نے ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیبی اقدار کا ہمیشہ دفاع کیا۔ اگرچہ آج یہ اقدار فرقہ پرستوں، دہشت گردوں اور تخریب کاروں کے ذریعے مسمار کی جارہی ہیں۔

لٰہذا آزاؔد کی پیش کردہ اقدار کو بچانا نہ صرف وقت کا تقاضہ ہے بلکہ عصرِ حاضر کی نہایت اہم ضرورت ہے۔ آزاد نے مختلف مذاہب کے اتحاد کے سلسلہ میں "وحدتِ ادیان" کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جسے آج کے مسائل کے پیش نظر سمجھنا اور عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے[2] آزاؔد لکھتے ہیں:

"دنیا کے تمام مذاہب حق پر ہیں، لیکن دنیا کے پیروانِ مذہب حق سے منحرف ہوگئے ہیں۔ جس قدر بھی گمراہی ہے، جس قدر بھی اختلاف ہے پیروانِ مذہب کے فعل و عمل پر ہے۔ مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے، اگر پیروانِ مذہب کا

---

[1] خطباتِ آزاد مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء ص ۲۹۷ تا ۳۰۰۔

[2] وحدتِ ادیان کی تفصیلات کے لیے "ترجمان القرآن" ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، دہلی، جلد اوّل، ۱۹۸۰ء، ص ۲۵۰۔ ۴۴۰ ملاحظہ ہو۔

دہلی۔ طبع فروری ۱۹۶۹ء ص ۲۳)

ہندوستان میں مذاہب کے اعتبار سے آٹھ مذہب کے پیرو رہتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، بدھسٹ، جینی، زرتشتی، پارسی اور یہودی۔ ان کے علاوہ مختلف قسم کے بت پرست اور قبائلی عقیدوں کے گروہ بھی ہیں، شاید دنیا کے کسی ملک میں انسانی عقیدوں کی اتنی فراوانی نہیں ہے جتنی ہندوستان میں۔ ظاہر ہے کہ مذاہب کی اس رنگارنگی میں متحدہ قومیت کے استحکام اور تقویت کا مسئلہ قدرے پیچیدہ اور مشکل الحل ہو جاتا ہے۔[1]

مولانا آزاد کو اس پیچیدہ مسئلے کا احساس تھا۔ انھوں نے متحدہ قومیت کی اہمیت اور اس میں مسلمانوں سمیت ہندوستان کے تمام فرقوں کی شمولیت پر کافی کچھ لکھا اور ملک میں آباد تمام مذاہب کے ماننے والوں میں تقریر و تحریر کے ذریعہ باہم اتحاد پر بار بار روشنی ڈالی ہے۔ خاص کر انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر کافی زور دیا، ''خطباتِ آزاد'' میں ان کا بیان ہے، ''ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے ۔ .... ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے......... . ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے........... اب یہ سانچا ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت، سیاست، پیغام مرتبہ رشید الدین خاں، ۱۹۸۹ء ترقی اردو بیورو، دہلی، ص ۱۰۶۔

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاشِ
زیاں و نقصان میں آتے ہیں صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ
نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں عیش کے پھول نہیں بلکہ
خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں"۔[1]

اسی طرح ایک رئیس کی جانب سے جب انھیں ایک خطیر رقم کا چیک بطورِ اعانت بھیجا گیا تو اس کو واپس کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

"ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی
انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہو، وہ اخبار نہیں
بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبہّ اور سر تا سر عار ہے"۔[2]

آج کئی اخبار اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنا ضمیر تک فروش کیے ہوتے ہیں یہاں تک کہ کئی اخبار ذاتی، علاقائی، اور مخصوص مذہبی و فرقہ وارانہ مفاد کے لیے ملکی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش میں مصروف و مشغول ہیں۔ آزاد نے اپنی صحافت کے ذریعے ہندوستان کے تمام منتشر فرقوں کو مطمئن کر کے انھیں تحریکِ آزادی کے قومی دھارے میں شامل کرنے کی پر خلوص کوشش کی تھی۔ خاص کر انھوں نے مسلمانوں کو اسلامی علوم کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کرائی کہ ملک سے وفاداری کا جذبہ ایک اہم دینی فریضہ ہے جس سے روگردانی کرنا اسلامی روایات کی خلاف ورزی ہوگی۔

---

[1] ایوانِ اردو، دہلی، آزاد نمبر، دسمبر ۱۹۸۸ء یوپی اردو اکادمی، جلد اوّل، ص ۵۔

[2] ایضاً ص ۴۹۔

انحراف دور ہو جائے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو حق ہے۔......[1]

مولانا ابوالکلام آزاد کی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا تھا۔ مولانا نے جس وقت صحافت کے میدان میں قدم رکھا اس وقت ہندوستان اور مسلم معاشرے میں جمود و تعطل کی فضا طاری تھی۔ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے مولانا نے ایک خوابیدہ معاشرے میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی انھوں نے تقریباً ایک درجن جرائد و رسائل کی ادارت کی۔ اور اپنی علمی، عملی، صحافتی اور سیاسی جد و جہد سے ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی راہ پر لا کھڑا کیا۔ وہ صحافت ہی کے راستہ سے سیاست کی پر پیچ وادیوں میں داخل ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے ملک و ملت کی جو رہبری اور رہنمائی فرمائی ہے وہ ناقابلِ فراموش تو ہے ہی عہدِ حاضر کے اہم اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے (حل کرنے میں) ہمیں ان کی یادگار تقریر و تحریر کے ذریعہ بخوبی رہنمائی اور مدد حاصل ہو سکتی ہے۔

دراصل آزاد کی صحافت ذاتی اغراض و مفاد کے بجائے ملکی مفاد پر مشتمل تھی۔ انھوں نے اردو صحافت کو ایک معیار اور وقار عطا کیا۔ اردو صحافت کا شاہکار ''الہلال'' کلکتہ، صحافت کی دنیا میں ان کا ایسا گراں قدر کارنامہ ہے جس نے نہ صرف تاریخ صحافت بلکہ تحریکِ آزادی ہند میں بھی ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے صحافت کے ذریعے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ آج کی آمادہ بہ زوال صحافت کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ آزاد کا کہنا تھا:

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر کامل قریشی، ص ۱۹۹۔

زبان میں خطاب کیا۔ صرف ان کے خیالات اور نقطۂ نظر ہی
میں جدت نہیں تھی بلکہ ان کی تحریک کا رنگ بھی نیا تھا۔ ان کا
اسلوبِ بیان جاندار اور پرزور تھا"۔[1]

آزاد ہندو مسلم اتحاد کو ملک کی بنیادی اور اہم ضرورت سمجھتے تھے اور اس کی تکمیل کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھے۔ اس ضمن میں ان کا بیان تھا:

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دست بردار نہ ہوؤں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے"۔[2]

آج سیاسی جماعتیں اپنے ذاتی مفاد اور ووٹ بینک کی خاطر ہندو مسلم تنازعے پیدا کرتی ہیں۔ مندر مسجد کی بات کی جاتی ہے ملک دشمن عناصر مختلف صوبائی اور علاقائی مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں مولانا آزاد کے مذکورہ بالا پیغام کو یاد رکھنا اور اسے عام کیا جانا دورِ حاضر کی نہایت اہم ضرورت ہے۔

مولانا آزاد نے مطالبۂ پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ انھوں نے متحدہ

---

[1] عرش ملسیانی (نوٹ۔۱) ۲۶۔۲۷۔
[2] خطباتِ آزاد۔ مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، دہلی ۱۹۹۰ء ص ۲۰۵۔

آزاد نے مسلمانوں کو یہ بات بھی بار بار باور کرائی کہ وہ قومی تحریک کے دھارے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور باہم میل ملاپ کے ذریعے ایک مقدس دینی روایت بھی ادا کریں۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے ''الہلال'' میں مولانا آزاد نے واضح طور پر یہ لکھا:

''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدو جہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے لیکن آپ (یعنی مسلمانوں) کے لیے ایک فرضِ دینی ہے اور داخلِ جہاد فی سبیل اللہ''۔[1]

آزاد نے ''الہلال'' کے ذریعے خوابِ غفلت میں سوتی ہوئی قوم کو بھی بیدار کیا۔ ان کا بیان ہے:

''آہ کاش مجھے وہ صورِ قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا............ اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیوں کہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پھر اس کی نہیں سنتے، جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے''۔[2]

الہلال کے ذریعے آزاد نے ایک منفرد اور جدید طرز میں مسلمانوں سے خطاب کیا جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں لکھا ہے:

''مولانا آزاد نے ''الہلال'' میں مسلمانوں سے ایک نئی

---

[1] الہلال۔ کلکتہ، ۱۸؍ دسمبر ۱۹۱۲، یوپی اردو اکادمی، جلد اوّل ص ۵۔

[2] کمالِ ابوالکلام، ص ۱۰۷۔

تشکیل سے جتنے مسئلے حل ہوں گے اُن سے زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ [1]

آزاد کی یہ پیشین گوئی سو فیصدی صحیح ثابت ہوئی ہے۔ کارگل اور کشمیر کے علاقے میں پاکستان کے ذریعے جو دہشت گردی پھیلائی جارہی ہے اس سے پورا ملک بخوبی واقف ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی آج کے مسائل میں مولانا آزاد کی معنویت کی ایک اہم مثال ہے۔

تشکیل پاکستان کے بعد آزاد نے یہ بھی کہا تھا:

"۔۔ ہندوستان اور پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ دوستانہ روابط پیدا کریں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں۔ اس کے علاوہ اگر دوسرے راستے اختیار کیے گئے تو وہ اور زیادہ پریشانی کا سبب بنیں گے"۔ [2]

مولانا آزاد نے ایک عرصہ قبل جس بات سے آگاہ کیا تھا وہ آج تک صحیح ثابت ہوئی ہے۔ دونوں ملکوں کا دفاع پر کثیر سرمایہ خرچ ہوا ہے اور حال ہی جنگِ کارگل میں ہزاروں (کشمیری) افراد بے موت مارے گئے ہیں اسے کون نہیں جانتا؟

آج کے حالات و مسائل میں مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور اقوال و اعمال کا عمیق مطالعہ جس اہمیت کا حامل ہے وہ "عیاں راچہ بیاں" کے مصداق ہے۔

---

[1] انڈیا ونس فریڈم، ص۱۵۔

[2] انڈیا ونس فریڈم، ص۲۴۸۔

ہندوستان کا خواب دیکھا تھا۔ تشکیلِ پاکستان اور تقسیمِ ہند کے لیے جب مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل راضی ہوگئے تھے اس وقت بھی آزاد اس پر تیار نہ تھے۔ انھوں نے یوپی سے پاکستان جا رہے ایک گروہ سے یوں خطاب کیا تھا:

> "آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔ کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی، ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورت حال سے نمٹ سکتے ہیں۔ مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا، جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے"۔ [1]

مولانا آزاد کی یہ دور افتادہ صدا، ان میں مستقبل کی نبض شناسی، ان کی دوربینی اور آج کے مسائل میں ان کی معنویت پر دلالت کرتی ہے۔

آزاد نے تشکیلِ پاکستان سے متعلق یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ پاکستان کی

---

[1] ایوانِ اردو، دہلی، آزاد نمبر، دسمبر ۱۹۸۸ء۔